

مولانا حیدر علی مینوی*

یادوں کا چمن

دودن کی زندگی ہے یہاں اپنی خوشی سے کوئی آتا ہے نہ اپنی خوشی سے جاتا ہے، موت و حیات کے مالک نے اس زندگی کو امتحان قرار دیا ہے۔ ”الذی خلق الموت والحیوة لیبیلوکم“ (الایۃ)

امتحان بھی ایسا ہے جو عام بندگان خدا ہی کا نہیں، روئے زمین کے مقدس ترین لوگ انبیاء علیہم السلام کا بھی ہوا ”واذابتلی ابراہیم ربہ بکلمۃ فاتمہن“ یاد کرو وہ وقت جب ابراہیمؑ کے رب نے اس کو کچھ باتوں میں آزمایا اور اُن باتوں کو ابراہیمؑ نے پورا کیا، جس کے نتیجے میں ابراہیمؑ کو ساری دنیا کا امام بنادیا، امتحان کی بھٹی سے سب نے گذرنا ہے۔ صحیح سلامت ہمیشہ مومن نکلتے رہیں، ایک لمبی تاریخ ہے کئی صدیوں پر مشتمل ہے عشق و وفا کا ایک نہ ختم ہونے والا باب ہے، اچھے نمبروں سے پاس ہونے والوں کے لئے مشکوٰۃ نبوت سے مرادہ آفرین.....

أولئك الذین اردت غرست کرامتهم بیدی وختمت علیہا فلم ترعین ولم تسمع اذن ولم یخطر علی قلب بشر، یہ وہ لوگ ہے جن کو میں نے منتخب کر لیا ہے اور میں نے ان کی شرافت و کرامت پر مہر لگا دی ہے۔ (جس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوگی) نہ اس کو کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا، نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا خیال گزرا ہوگا اور میرے اللہ نے فرمایا ”فلا تعلم نفس ما احفی لهم من قرۃ اعین“ (الایۃ) راہ حق کے اس قافلے سے دودن پہلے میرے استاد محترم حضرت مولانا ابراہیم فانی صاحب ”پچھڑے گئے، اس درد اور غم کے بیان کے لئے وہ اپنے ساتھ لکھنے والا قلم بھی لے گئے، حضرت سے میرے تلمذ اور تعلق کی نسبت ایک عشرہ قبل ۲۰۰۳ء میں اُس وقت ہوئی جب میں نے درجہ خلسہ کیلئے دارالعلوم حقانیہ میں داخلہ لے لیا، جدید طالب علم ہونے کی وجہ سے مجھے اُن سے کوئی تعارف نہیں تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس سال حضرت فانی صاحبؒ کا ہمارے کلاس کے ساتھ حسامی کا پیروی تھا۔ اُصول فقہ کی یہ مشہور کتاب ایک خالص علمی شخصیت کے پاس ہونا نہایت موزوں تھا۔ ابتدائی دن گزرنے لگے تو فانی صاحبؒ سے تعلق خاطر بڑھتا گیا۔ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے قادر الکلام شاعر، بے باک تبصرہ نگار، صاحب طرز ادیب، صحافت کی ترکش سے مستعار لئے ہوئے لب و لہجہ کے مالک، ایک رحمدل اور شفیق استاد، ظرافت طبعی اتنی کہ کبھی اُن کے کلاس میں غبی طالب علم کو بھی اکتاہٹ محسوس نہ ہوتی، کلاس میں آنے کا ایک خاص

انداز ہوتا سیدھا مسند پر جاتے کسی کو دیکھے بغیر متعلقہ جگہ سے درس کا آغاز ہوتا، درس کیا ہوتا..... اللہ اکبر..... نسیم وصبا قربان ہونے کے لئے مچلتے، مشکل ترین جگہوں کو چٹکلیوں میں حل کرنے کا جیسے آپ کو دودھ پلایا گیا ہو۔ خشک مباحث کو اپنی طبعی ظرافت سے ایسا رنگین بناتے کہ کبھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا، دورانِ درس اپنے تخلیقی اشعار بھی سناتے جس سے ماحول کشت و زعفران بن جاتا، واہ واہ کے نعرے بلند ہوتے، خوشی اور سرور میں ایک دوسرے پر کودنے اور لوٹنے پوٹنے کا ماحول بن جاتا۔ ہمارے ہاں مدارس میں استاد کے سامنے بیٹھنے کا ایک خاص دائرہ ہوتا ہے جس سے تجاوز کی اجازت نہیں ہوتی، اس معاملے میں فانی صاحب کو بالکل جد پائے ان کے ہاں ایسا کوئی ضابطہ نہیں دیکھا، کھل کر اظہار خیال کا موقع دیا جاتا، طالب علم کی تنبیہ ہوتی تو وہ بھی کسی لطیفے کے ضمن میں، یا شعر کے چٹکی سے، میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ منطق کی کتاب قطبی میں دلالت مطاہقی اور تقصیمی کے بحث میں مصنف نے توسط کی قید لگائی ہے، مجھے اُس میں ابہام پیدا ہوا اور خیال گزرنے لگا یہ قید نہیں لگانی چاہئے تھی..... خیر میں نے ایک چٹ پر اپنا سوال لکھا، استاد جی نے چٹ پر بھی کتاب سے نگاہ اٹھا کر طالب علموں کی طرف دیکھ کر میرے سوال کے بارے میں لطیفہ سنایا، فرمایا حجام کے پاس کوئی شخص بال مندوانے بیٹھ گیا تو حجام سے کہنے لگا یہ بتاؤ میرے سر پر کتنے بال ہونگے۔ حجام نے کہا بس تھوڑا سا انتظار..... اب بال تیری جھولی میں پھینک دوں گا خود گن لینا، فرمایا جو سوال چٹ پر لکھا گیا ہے دو تین دن بعد اُس کا جواب آرہا ہے، مولانا فانی کے طنز و مزاح کا اپنا منفرد انداز تھا آپ کا ڈھنگ ڈول دیکھ کر یہ انداز لگانا قطعاً مشکل تھا کہ یہ درویش خدا مست اور فقیر انسان جامعہ حقانیہ جیسی یونیورسٹی کے استاد حدیث، بیک وقت چار زبانوں پر عبور اور ان پر قابلِ قدر مجموعہ کلام، کئی علمی کتابوں کے مصنف، مورخ، سوانح نگار اور اعلیٰ درجہ کے مدرس ہے۔ زمانہ طالب علمی میں اس فقیر کو اللہ تعالیٰ نے حضرت کی صحبت میں بیٹھے اور موتیاں چننے کا موقع نصیب کیا، ظہر کے بعد حضرت کے دولت کدے پر حاضر ہوتا، دروازے کو دستک دیتا مولانا خود آکر دروازہ کھولتے، اور میں حضرت کی باتوں کا رخ کسی موضوع کی طرف موڑ دیتا ان کی معلومات میں سمندر کی سی گہرائی تھی، غضب کا حافظہ لائے تھے۔ ایک دفعہ میں نے ہندوستان کے مشہور عالم ابو حنیفہ ہند علامہ عبدالحی لکھنویؒ کے بارے میں پوچھا، اس دن مجلس کا موضوع مولانا عبدالحی لکھنویؒ تھے۔ خاندانی پس منظر، علمی منازل کا ارتقاء، لکھنے کے ادوار، مولانا نواب صدیق حسن خان صاحبؒ سے قلمی مناظرے اور نہ جانے تاریخ کے کتنے دروازے تھے جو واہ ہوتے چلے گئے۔ ایک عجیب بات میں اس مجلس میں نوٹ کی جس کا تعجب آج تک ذہن پر نقش ہے وہ یہ تھی فرمایا، مولانا عبدالحی صاحبؒ اور نواب صاحبؒ دونوں موضع ”کوٹھا“ کے مولانا سید عبداللطیفؒ کے شاگرد رہ چکے تھے۔ مولانا سید عبداللطیفؒ حضرت سید امیر المعروف بہ حضرت جی کے فرزند ہے۔ حضرت جی بابا امیر عزیمت سید احمد شہیدؒ کے معتمد خاص بزرگ گزرنے والے ہیں۔

چھپ گئی ہے۔ اگر یہ واقعہ سند کے لحاظ سے درست ہو تو صرف کوٹھا اور صوابی ہی نہیں اس اعزاز اور فخر میں پورا ملک شامل ہے۔

اُولئِكَ اَبَائِي فَجَنَنِي بِمَثَلِهِمْ اِذَا جَمَعْتَنِيَا جَدِيرَ الْمَجَامِعِ

علم اُن کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی ان کی ہر مجلس کا آغاز بھی کسی علمی گفتگو پر ہوتا اور اختتام بھی، یہ کوئی مبالغہ نہیں، حقیقت یہ ہے علم اس کا حال بن گیا تھا۔ ہمیشہ پست آواز میں نرم لہجہ اور مسکراتا ہوا چہرہ اب بھی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے، کلاس میں ایک دفعہ جمعرات کے دن بہت سارے طلباء نے چٹ لکھے۔ کلاس میں ایسی چٹوں پر عموماً سبق کے متعلق کوئی شکل یا اعتراض ہوتا استاد جی ایک ایک چٹ پڑھتے رہے..... لیکن یہ کیا..... ہر چٹ پر ایک ہی بات ”کوئی شعر ارشاد ہو“ استاد جی نے چٹوں کو جمع کر کے پھاڑ دیا، اچھلتے ہوئے طلباء کی طرف پھیکا اور فرمایا درس ہے مشاعرہ نہیں۔

کتنے شریں ہے تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

اردو فارسی اور پشتو کے بہترین ادیب تھے۔ پشتو شاعری میں، ”از غنی و تمنا، و میژن تصورات، اور بیا در دونہ پہ خندادی“ پشتو ادب میں قابل قدر اضافہ ہے جسے انشاء اللہ مدتوں یاد رکھا جائے گا، اردو میں آپ کے مرثیے، ”دغباے فراق“ کے نام سے کئی سال ہوئے چھپ گئی ہے اور اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقہ بنادیا ہے، آپ کے والد گرامی صدر المدرسین پر ایک انتہائی علمی اور تاریخی دستاویز بھی آپ کے قلم کا شاہکار ہے، آپ کی زندگی کی آخری نظم ”ماہنامہ الحق“ میں داستان دلکشا در زمان، ابتلاء“ کے نام سے شائع ہوئی اور اس کے بعد آپ کا قلم ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گیا، مولانا فانی صاحب نے اپنی مستعار زندگی کے لمحات پورے کر لئے اور دنیا سے رخصت ہو گئے اپنی زندگی سے انہوں نے علمی دنیا کو جو سبق دیا وہ یہ ہے کہ علم دین کے طالب علموں کو اس وقت جن چیلنجوں کا سامنا ہے اس کے لئے سطحی اور سری انداز نہیں بلکہ ٹھوس اور مضبوط علم حاصل کرنا ہوگا، قلم اور کتاب سے تعلق کا حال یہ ہو۔

لیلیٰ بھی ہمنشین ہو تو حمل نہ کر قبول

اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

☆☆☆

کس طرح ٹوٹے گا یا رب حلقہ زنجیر غم

آتشیں نالوں سے میرے وہ پگھل سکتا نہیں

(فاتی)

مولانا عبدالباری *

یہ جہاں فانی ہے کوئی چیز لا فانی نہیں

ہوا تھی گو تند و تیز مگر چراغ اپنا جلا رہا تھا

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے تھے اندازِ خسروانہ

حضرت استاد مولانا محمد ابراہیم فانی رحمہ اللہ نے جس ماحول اور گھرانے میں آنکھ کھولی، وہ ایک علمی، دینی اور مذہبی گھرانہ اور ماحول تھا۔ آپ کے والد ماجد فاضل دیوبند حضرت مولانا شیخ الحدیث عبدالحلیم صاحب صدر المدرسین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مایہ ناز استاد اکل گزرے ہیں، جو ابھی تک علمی حلقوں میں صدر صاحب کے لقب سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ آپ کا پیدائشی تعلق ضلع صوابی کے علم و فضل میں مشہور و معروف قصبہ ”زروبی“ سے ہے، جو عرصہ سے علم و عرفان، تصوف و سلوک، قرآن و حدیث کے علوم کا امین رہا ہے۔ اسی قصبہ میں بہت سارے علماء و فضلاء، مفسرین، محدثین، فقہاء اور صلحاء امت گزرے ہیں جو اپنے وقت کے نابغہ روزگار، ماہرین الفنون اساتذہ و اساطین علم تھے۔ ان حضرات کے قافلے کے شہسوار حضرت استاذ مولانا محمد ابراہیم فانیؒ بھی تھے۔ جب بھی ضلع صوابی کے اہل علم و عرفان، صوفیائے کرام، مصنفین، شعراء اور اہل فن و قلم کا تذکرہ ہوگا، تو حضرات الاستاذ کے بغیر ادھورا رہے گا۔ زمانہ حال ہی میں جبکہ علمی و عملی انحطاط روز افزوں ہے، اور قابل قدر ماہرین فن و اساطین علم یکے بعد دیگرے دنیا سے پردہ فرما رہے ہیں، اور زمانہ ”یذهب العلم بذهاب العلماء“ کا مصداق بن رہا ہے، ایسے کٹھن اور پرفتن دور میں اگرچہ اصحاب علم و فضل کی ضرورت روز افزوں بڑھ رہی ہے، لیکن خالق کے فیصلے کے سامنے مخلوق کی ہر تدبیر سیلاب کے سامنے بند باندھنے کے مترادف ہے۔ حال ہی میں استاد محترم حضرت علامہ محمد ابراہیم فانیؒ اپنے تلامذہ، خدام و متوسلین کو سگووار چھوڑ کر داغ مفارقت دے گئے۔ ایسی علمی و ہم گیر شخصیت کی وفات علمی دنیا کے لئے ایک زبردست المیہ ہے۔

ماکان هلكَ قيس هلكَ واحدٍ لكن بنیان قوم تہدماً

اور ایسے اہل علم و فضل کے جانے سے جو خلا پیدا ہو جاتی ہے، اسکا پر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ حدیث کا مفہوم ہے کہ عالم کی موت سے اسلام میں ایک دراڑ پیدا ہوتا ہے۔ نیز ارشاد ہے کہ پورے قبیلے کی موت ایک عالم کی موت سے ہلکی ہے۔ لیکن کیا کرے؟ دنیا کا یہی دستور ہے، اور کوئی بھی دنیا میں نہ ہمیشہ رہا ہے اور نہ رہے گا۔

ہوئے نامور بے نشان کیسے کیسے
زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے

اللہ کریم سے دست بدعا ہوں کہ حضرت الاستاذ کی کروٹ کروٹ جنت الخلد میں داخل فرمادیں، اور پس ماندگان کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا فرمائیں۔ انشاء اللہ! حضرت استاد کے مایہ ناز خدام اور تلامذہ آپ کے دینی، تدریسی، تصنیفی مشن کو آگے بڑھانے میں جدوجہد و کوشش کرتے رہیں گے، اور آپ کے علمی ورثے کو محفوظ کر کے آئندہ نسلوں تک منتقل کرتے رہیں گے، جو یقیناً حضرت کے لئے اُخروی درجات کے حصول کا سبب بن کر ”مَنْ صَارَ بِالْعِلْمِ حَيًّا، لَمْ يَمُتْ أَبَدًا“ کا مصداق بنے گا اور آپ کی روحانی تسکین کا ذریعہ ہوگا۔

1990ء میں راقم الحروف نے دیوبند ثانوی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں داخلہ لیا تو حضرت الاستاذ سے سال اول ہی میں شناسائی ہوئی۔ آپ ہمیں منطق کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ قبل از درس آپ ضرور حاضری لیتے تھے۔ اکثر طلباء لبیک کے بجائے یس سر کہتے تھے، کیونکہ عموماً طلباء سکول و کالج سے پڑھ کر آئے تھے اور سکولوں میں حاضری کے دوران یس سر ہی کہا جاتا ہے، جس سے استاذ محترم کی طبیعت پر گرانی ہوتی، اس لئے طلباء کو سمجھاتے تھے کہ لبیک کہا کریں تاہم بعض طلباء پھر بھی ہٹ دھرمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ بھول کر عادت کی وجہ سے یس سر کہتے تھے جس پر استاذ محترم ناراض ہو کر کہتے کہ آپ لوگوں کے دماغ، مرغی کی طرح ہے کہ جلدی بات بھول جاتے ہو۔ اللہ کریم نے تدریس کے ملکہ سے آپ کو نوازا تھا۔ اور آپ طبعی طور پر درس و تدریس کے آدمی تھے، اور تدریس ان کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ گویا کہ علوم نبویہ اور فنونِ دینیہ کی تدریس بھی ان کی روح و جان کی اصل غذا اور مدارِ حیات ہے۔ علمی سرمایہ کو مقید کرنے اور آگے پھیلانے اور منتقل کرنے کا سب سے ذوداثر و مؤثر ذریعہ درس و تدریس ہے۔ ہمارے جتنے بھی اکابرین دیوبند و اساتذہ کرام اکوڑہ خٹک میں گزرے ہیں، ان کی شہرت اور علمی عظمت کی وجہ تدریس تھی۔

حضرت الاستاذ کی طرز تدریس انوکھی تھی۔ لمبی لمبی تقریریں اور خامخواہ قیل و قال کی بحث کرنا آپ کی عادت نہ تھی، بلکہ مختصر وقت میں سارے سبق کا خلاصہ قلیل الفاظ میں سمٹ کر بیان فرماتے۔ مشکل سے مشکل عبارت کے حل کرنے میں نہایت سہل انداز سے کام لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ غبی سے غبی طالب علم بھی سبق سمجھ لیتا۔ مختصر وقت میں سبق ختم کر کے سیدھے درس گاہ سے باہر تشریف لے جاتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہمارے ایک ساتھی جو کچھ بیماری کے وجہ سے کسمندی کے شکار تھے۔ ایک دفعہ ایسے وقت میں میں نے اسے درس گاہ آ رہے تھے کہ حضرت الاستاذ

نے سبق ختم کر کے ہم درس گاہ سے واپس جا رہے تھے۔

الغرض استاذ محترم نے تادم مرگ اشتغال باعلم اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھ کر علم کے دریا بہاتے رہے۔ آپ اپنی ذہانت، تجربہ علمی و رسوخ فی العلم کی بدولت تمام دینی و علمی اور عوامی حلقوں میں نہایت مشہور تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ آپ بلند پایا، ادیب، مصنف اور مؤلف بھی تھے۔ آپ اپنے علمی تالیفی کمالات میں اکابرین کے سچے جانشین اور ان کا مایہ ناز یادگار تھے، جن پر آپ کی محققانہ مؤرخانہ اور ادبیانہ علمی تالیفات و تصنیفات شاہد عدل ہیں۔ آپ کے کئی تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں، جن سے علماء اور عوام الناس استفادہ کر رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ یہ کتابیں حضرت الاستاذ کی آئندہ نسلوں سے روحانی رابطے کا ذریعہ ہوں گی۔ حضرت الاستاذ، پشتو، فارسی، اردو، ان تینوں زبانوں کے بیک وقت قادر الکلام شاعر تھے۔ میں ایک ڈاکٹر کے پاس بیٹھا تھا جو کہ ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ شاعری کا مشغلہ بھی رکھتے تھے۔ اس نے کہا کہ حضرت فانی صاحب پشتو زبان کے وہ واحد شاعر ہیں جس کا فارسی زبان میں مجموعہ چھپ کے آ رہا ہے، جبکہ اور حضرت الاستاذ کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آچکی ہیں۔

بایں علم و فضل اور ہمہ کمالات سے متصف ہونے کے باوجود حضرت الاستاذ عادات و اطوار کی سادگی میں خود اپنی مثال آپ تھے ہر قسم کی تکلیف سے دور رہتے۔ گفتگو طرز کلام میں کوئی تصنع نہ تھا۔ سادہ وضع کے کپڑے پہنتے تھے۔ لباس میں کسی قسم کے ترف و تصنع سے کام نہ لیتے۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ حدود کے اندر انتہائی شفیقانہ رویہ رکھتے تھے۔ آپ نہایت خاکسار اور شریف الطبع قسم کے آدمی تھے۔ طبیعت میں ظرافت بھی تھی لیکن ایسا بر محل استعمال کہ آپ کے رعب و ادب میں کوئی کمی نہ آتی۔ ہمارا ایک رشتہ دار جس کا نام گوہر زمان ہے، اس کا حضرت الاستاذ کے ساتھ زمانہ طالب علمی میں بہت تعلق تھا۔ درجہ خامسہ کے سال جبکہ ہم حضرت الاستاذ سے متنبی پڑھ رہے تھے، آپ ہمارے کمرے تشریف لے آئے کمرے میں کئی ساتھی تھے۔ مولوی نقیب احمد جہانگیر وی بھی موجود تھے۔ تو انھوں نے ہنس کر حضرت الاستاذ سے کہا کہ مولوی گوہر نے گناہ کبیرہ و صغیرہ دونوں سے توبہ کی ہے اس جملہ سے ساری مجلس بہت محفوظ ہوئی۔

ایک دفعہ میں نے حضرت سے کہا کہ چائے کے لئے ہمارے کمرے میں تشریف لے آئیں حضرت نے اثبات میں سر ہلایا کہ میں آ رہا ہوں میں کمرہ جا کر نہایت پریشان ہوا کہ کمرے میں کوئی ساتھی نہیں، کیونکہ چائے کے ساتھ عدم ذوق کی وجہ سے چائے بنانا مجھے نہیں آتا، تاہم! ساتھ والے کمرے کے ایک ساتھی سے رہنمائی حاصل کر کے چائے میں نے بنائی۔ معلوم نہیں چائے کیسی تھی تاہم حضرت الاستاذ نے نوش فرمائی۔

زمانہ طالب علمی کے بعد بھی کبھی کبھار حضرت الاستاذ سے ملاقات ہوتی تھی۔ نہایت محبت و شفقت کا معاملہ فرماتے۔ آپ کا ہنس کھ اور پرور چیزہ دیکھ کر ہمارا دل خوشی سے جھوم اٹھتا۔ حضرت نے میری پہلی تالیفی اور

تصنیفی کاوش ”تقویٰ و اہل تقویٰ“ پر شاندار تبصرہ بھی لکھا تھا، جو یقیناً میرے لئے اعزاز ہے۔ آپ تحریری و تالیفی میدان میں اپنے شاگردوں کی بہت حوصلہ افزائی فرماتے، اور اس میدان میں قدم رکھنے پر مبارک باد پیش کر کے آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔

حضرت الاستاذ کے ساتھ اس عاجز کی بہت ساری یاداشتیں وابستہ ہیں۔ حضرت کا میرے والد محترم (جو کہ حقانیہ کے فضلاء میں سے ہیں، اور حضرت الاستاذ کے ہمنوا بھی تھے) کے ساتھ اچھا تعلق تھا۔ ملاقات کے دوران ضرور مجھ سے میرے والد صاحب کی خیریت دریافت فرماتے تھے حضرت کی علالت کا علم پہلے سے تھا، لیکن شدت مرض کی خبر اکوڑہ خٹک ہی میں ہوئی۔ وہاں ایک صاحب نے کہا کہ حضرت کا شوگر بہت ہائی ہے، جس سے آپ کے دونوں گردے بھی متاثر ہیں۔ یہ جانکاہ خبر سن کر نہایت پریشانی ہوئی اور بہت شدت کے ساتھ ملاقات و بیماری پر سی کی خواہش دل میں پیدا ہوئی۔ حضرت حیات آباد کمپلکس ہسپتال کے کڈنی سنٹر میں زیر علاج تھے۔ آپ کے انتقال پر ملال سے دودن قبل مولانا عصمت اللہ لکی مروت بھائی، بختیار مینوی اور راقم اٹیم ہم تینوں ہسپتال گئے، لیکن حضرت الاستاذ کی حالت دیکھ کر پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا۔ ہم اپنے اس استاد کے سامنے ایسی حالت میں کھڑے تھے کہ کسی زمانے میں جب آپ کے سامنے آجاتے، تو مصافحہ پر اکتفاء کئے ہوئے بغیر پر جو شیلے انداز میں معاملہ کرتے اور ایک سانس میں کئی باتیں کر جاتے۔ لیکن وہی شخصیت ایسی خاموش کہ ہمارے آنے سے بے خبر۔ وہاں موجود حضرت الاستاذ کے صاحبزادہ اور شاگردوں سے ہم نے پوچھا کہ حضرت کی بیماری کا کیا حال ہے؟ وہ نہایت مطمئن تھے کہ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ حضرت جلد ہی رو بہ صحت ہو جائیں گے۔ تاہم! حضرت کی ظاہری خدو خال دیکھ کر دل کو یہ باور کرانا مشکل تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ حضرت الاستاذ بہت جلد ہی دنیا کی سرحد کو پار کر کے آخرت کے میدان میں پہنچ جائیں گے۔ بلاریب! موت و حیات اس عالم کون و فساد کا خاصہ ہے۔ زندگی موت کی تمہید ہے۔ یہاں کا مقیم کل کا مسافر ہے۔ اللہ کا تکوینی فیصلہ ہے ”کل نفس ذائقۃ الموت“ سے نہ نبی مستثنیٰ ہے، نہ ولی، نہ عالم اور نہ جاہل، سب نے موت کا پیالہ چھلنا ہے۔

بدھ کے دن کسی نے موبائل پیغام پر یہ جانکاہ خبر بھیجی کہ حضرت الاستاذ محمد ابراہیم فانی وفات پا گئے۔ ان کا پہلا جنازہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں ادا کیا جائے گا اور دوسرا اپنے گاؤں زرubi میں۔ گویا حضرت الاستاذ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے ایسے جدا ہو گئے کہ اگر سمندر کو کھ گال لائے تو بھی نہیں ملیں گے۔

چل دیئے آخر زبانوں یہ کہانی چھوڑ کر

عالمِ باقی کی جانب دارِ فانی چھوڑ کر

جناب شیرزادہ *

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

چند دن پہلے پاکستان، بالخصوص خیبر پختونخوا کے علمی و ادبی حلقوں کو سوگوار بنا کر دیوبند ثانی جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کا ایک مایہ ناز فرزند، مشاق مدرس، مشتاق ادیب، کہنہ مشق شاعر، پیکر صدق و اخلاص، صوبہ بھر کے استاد العلماء اور سابق صدر المدرسین جامعہ حقانیہ حضرت مولانا عبدالحلیم زروبوئیؒ کے صاحبزادے، حضرت مولانا محمد ابراہیم فانی مختصر علالت کے بعد اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔ ان کی موت کا ماتم تھا دارالعلوم حقانیہ یا زروبی کا ماتم نہیں، پوری ملت اسلامیہ کا ماتم ہے۔ اخلاق، شرافت، سنجیدگی، علم و ادب، قرطاس و قلم شعر و غزل اور فضل و کمال کا ماتم ہے۔

مرثیہ ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا

وما کان قیس هلک، هلک واحد ولکنہ بنیان قوم تہدما

مرحوم کا شمار ان گنے چنے علماء میں ہوتا ہے، جنہوں نے بہت کم عمری میں علمی پختگی کے شاندار معرکے سر کئے، دیوبند سے وابستہ علمی حلقوں میں زکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد شعر و شاعری میں نفاست، روانی، آمد اور زبان و بیان میں طلاقت و سلاست سے متصف تھے، اسی طرح الفاظ و معانی کے انتخاب میں حد درجہ مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے بڑے بڑے علماء کو شعری زبان میں خراج عقیدت پیش کیا، ان کی تاریخائے وفات کو بہت عقیدت کے ساتھ درد بھرے معنی خیز اور نصیحت آموز قطعات میں بیان کئے۔ ملک بھر کے بلند پایہ رجال فن اور جبال علم علماء کی مجالس و محافل سے فیض یاب ہوئے اور خود ان کو بھی اپنے علمی و ادبی رسوخ و تجربے سے فائدہ پہنچایا۔ دارالعلوم حقانیہ جیسے مرکز علم و العلماء کی مرکزی و معیاری حیثیت اور مقام و مرتبہ نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی، اور کم عمری ہی میں آسمان علم و فضل کا تابندہ و درخشاں منور و صوفشاں ستارہ بن گیا۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کی کرامات تھیں کہ ملک بھر سے بہترین دماغ کے مالک اور اعلیٰ و ارفع ذہنی صلاحیتوں کے اصحاب ان کے قائمہ کردہ اس عظیم درسگاہ میں جمع ہوئے، ایسے عظیم رجال کار کہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک پوری جماعت پر بھاری اور اپنی ذات سے ایک انجمن تھا۔ مفتی اعظم حضرت مولانا محمد فرید صاحبؒ اور صدر المدرسین حضرت مولانا عبدالحلیم

زروبوی کا نام اس خطے میں ایسا کون ہے جس نے نہیں سنا ہوگا۔ مولانا عبدالحقؒ کی کرامات ہیں اور حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہ کی حسن قیادت اور مثالی رہبری ہے کہ آج بھی جامعہ حقانیہ ملک و ملت کی علمی، سیاسی ادبی اور روحانی رہنمائی میں قائدانہ کردار ادا کر رہا ہے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر انسانیت کے خون مقدس کی حفاظت اور ظلم و بربریت، سفاکی اور درندگی کو روکنے کی سعی مشکور فرما رہے ہیں۔

تاریخ ایک طرف اس کی فضاؤں میں درس و تدریس کے زمرے محفوظ کر رہی ہے تو دوسری طرف اس کی ادبی و تحریری کمالات کو محیطہ تحریر میں لا رہی ہے اور اس کی علمی انجمنوں، بیٹھکوں، مجالس و محافل کو حُر جان بنا رہی ہے۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم فانی بظاہر تو یہاں سے اٹھ کر اپنے بزرگوں اور اساتذہ کی تلاش میں دور کہیں نکل گئے ہیں، مگر ان کے علمی مذاکرے، شعری زمرے، تحریری شذرے ادبی پختارے اور بے مثال احبابی دھرنے یاد رہیں گے۔

لعمرك ما واری التراب فعاله ولكنها واری ثيابا واعظما

تعب ہے قبر فانی پر کہ اس نے کس طرح علم کے اس پہاڑ کو اپنی تنگنائیوں میں سمویا۔

ويا قبر فانی^(۱)، کیف واریت جوده وقد كان منه البر والبحر مترعا

حقانیہ کی افسردہ فضاؤں اور پڑمردہ صبح و شام سے کوئی پوچھیں کہ مفتی محمد تقی عثمانی آئیں گے، ڈاکٹر شیر علی شاہ مدنی، مفتی غلام الرحمن، مولانا عبدالقیوم حقانی اور قاری محمد عبداللہ جمع ہوں گے، تو مولانا محمد ابراہیم فانی کو اب کون مجلس میں شرکت پر آمادہ کرے گا؟ جسٹس محمد تقی عثمانی صاحب کی حرمین میں سنائی عشق و محبت کی والہانہ نعت اب انہیں کون درد بھری آواز میں سنائے گا۔ اور فانی کے تخلص کے ساتھ کون فانی اللہ کی باتیں نظم کرے گا؟

اب بزم علم و فن نظر آئے نہ کیوں بے نور سی جس سے روشن تھا چراغ علم و فن جاتا رہا ہائے! ہم فانی کو صرف ان کے تخلص اور ایک لفظی کھیل تماشا سمجھ بیٹھے تھے، ہمیں کیا خبر تھی کہ فانی کو اتنی جلدی ہے اور منزل پہ پہنچنے میں انہیں دیر ہو رہی ہے، حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی کی کتابوں پر تبصرے ”نقوش حقانی“ پڑھتا ہوں تو ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شان حضورؐ میں والہانہ اور بے ساختہ زبان سے کہی ہوئی نعتوں کو پڑھ کر، دربار نبویؐ سے ان کے تعلق پر عیش عیش کرا گھٹتا ہوں۔

تصنیف و تالیف:

حضرت مولانا محمد ابراہیم فانی اعلیٰ پائے کے علمی ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد صدر المدرسین حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الادب حضرت مولانا اعجاز علیؒ حضرت

مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ اور حضرت مولانا رسول خان ہزارویؒ جیسے اساطین علم کے شاگرد تھے۔ منہج فیض دارالعلوم دیوبند کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس کے فارغ التحصیل درس و تدریس، خطابت ادب اور تحریر و تصنیف کے میدانوں کے شہسوار ہوتے ہیں، چنانچہ یہ سب خوبیاں صدر المدرسین میں جمع تھیں اور وہاں سے مولانا فانی کو وراثت میں ملیں۔ اسی طرح مولانا محمد ابراہیم فانی کی بہترین تربیت ہوئی اور وہ حقانیہ کے سینئر مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ تحریر و تقریر، ادب، تصنیف و تالیف، تدوین و تادیب کے ماہر فن اور یکتائے زمانہ تھے۔ انہوں نے پہلی تصنیف اپنے والد محترم حضرت مولانا عبدالحلیم متوفی ۱۹۸۳ء پر لکھنے سے شروع کی، ان کی یہ پہلی تصنیف ۱۹۹۰ء کو منظر عام پر آئی۔ اس تصنیف میں انہوں نے بہت اعلیٰ مہارت، فنی رسوخ، زبان پر عبور اور عمدہ ترتیب و تدوین کا مظاہرہ کیا۔ یہ کتاب دیکھنے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، میری خوش قسمتی ہے کہ یہ کتاب مجھے حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی نے اپنے کتب خانے سے عنایت فرمائی اور اپنے محبوب دوست فانی کے ساتھ والہانہ محبت و تعلق کے ناطے مجھ ناچیز کو لکھنے پر ابھارا۔ حضرت حقانی کو اللہ تعالیٰ نے اکابر و اصاغر سے نزدیک ترین تعلق قائم رکھنے کا بہت اعلیٰ ذوق عطا فرمایا ہے۔ اس مصروف ترین دور میں فون پر اور خطوط کے ذریعے تعلق کو جوڑے رکھتے ہیں۔ یہ تعلق اتنا پکا اور مضبوط ہوتا ہے کہ مرنے والوں سے بھی بصورت دعا، تحریر، نثری مرثیوں اور لواحقین سے قریبی رابطوں کے ذریعے ہمیشہ جڑا رہتا ہے۔ اب کی بار مولانا فانی کو حقانی صاحب برابر یاد فرماتے رہتے ہیں اور زبان حال سے بتاتے رہتے ہیں کہ ع رفیق و لے نہ ازل ما

اسی طرح مولانا عبدالقیوم حقانی کی کتابوں پر انہوں نے وقتاً فوقتاً جو تبصرے اپنے گہر بار قلم سے قرطاس پر منتقل کئے وہ بعد میں ”نفوس حقانی“ کے نام سے چھپ گئے۔ یہ تبصرے بجائے خود ایک علمی خزانہ اور بکھرے لعل و جواہر ہیں جو ایک سچے اور محبت صادق ساتھی نے دوسرے صدیق مکرم کو پیش کئے ہیں۔ مولانا حقانی نے جو کچھ لکھا اس کی تو ایک دنیا معترف ہے مگر فانی مرحوم نے جس ذوق و شوق اور دل کی گہرائیوں سے انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے وہ ایک علمی و ادبی متاع گر انما یہ ہے۔ تبصرے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے دوست کے کام کو اجاگر کرتے ہوئے بین السطور انہوں نے بلا قصد اپنے علم و فضل کو منظر عام پر لایا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفت آید در حدیث دیگران

”نفوس حقانی“ کے پیش لفظ میں فانی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ قلم پر ان کی گرفت اور ایک مشتاق و باکمال ادیب ہونے کی دلیل اور ایک صاحب کرامت و پارسا شخصیت ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ ملاحظہ ہو:

”آخر میں اپنے معزز قارئین سے اجازت چاہتا ہوں اس دعا کیساتھ کہ اللہ تعالیٰ برادر م مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کو مزید لکھنے کی توفیق ارزانی فرمائے کیونکہ ابھی آپ کی عمر بھی شباب پر ہے اور قلم پر بھی بہار ہے۔

حیات مستعار کے یہ بہترین لمحات اگر قوم و ملک اور دین و ملت کی تعمیر و ترقی میں گزر جائیں تو یہ نہ صرف عظیم الشان ملی خدمت ہے بلکہ باعث اجر و ثواب عبادت اور جہاد ہے۔

کلیوں کو میں سینے کا لہو دے کے چلا ہوں
برسوں مجھے گلشن کی فضا یاد رکھے گی

غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک جانے والے کے الوداعی کلمات ہیں جو غیر ارادی طور پر ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں اور دکھ درد و غم و اندوہ کے موجودہ لمحات میں ان کا پیام تازہ معلوم ہو رہا ہے۔

فانی کی شعر و شاعری:

علماء دیوبند کا ایک امتیازی وصف ان کا ادبی ذوق اور بلند پایہ شعری رجحان و میلان ہے، چنانچہ اس سلسلے میں تقریباً سب بڑے بڑے جبال علم نے باقاعدہ طبع آزمائی فرمائی۔ حضرت مولانا اعجاز علی کی ادبی مہارت کسی سے مخفی نہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے آپ کی شان میں ”قصیدہ بہاریہ“ کہہ کر آپ کے ساتھ عشق و محبت کا ثبوت دیا۔ حضرت مولانا شرف علیؒ نے بھی شعر میں طبع آزمائی فرمائی ہے، مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے آپ کی شان اقدس میں قصیدے پیش کئے، اس شان کے ساتھ کہ عرب بھی ان کی اعلیٰ ادبی اور فنی مہارت کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اور ان کے فرزند ان ارجمند زکی کیٹیؒ اور مفتی محمد تقی عثمانیؒ نے بھی شعر میں طبع آزمائی کی۔ تقی عثمانی صاحب نے روضہ اقدس پر جو قصیدہ پیش کیا ہے وہ ان کے عشق رسول میں شوریدگی کی دلیل ہے۔ زکی کیٹیؒ تو بڑے مشتاق شاعر گزرے ہیں، ان کا مجموعہ شعر و غزل ”کیفیات“ کے نام سے چھپ گیا ہے۔ ہمارے پچھڑے محترم مولانا فانی اردو، پشتو، عربی اور فارسی چاروں زبانوں میں باکمال شاعر تھے، ان کے شعری مجموعے قبولیت کا مقام پاچکے ہیں۔ چند ایک شعری مجموعے یہ ہیں: ”نالہ زار“، ”ازنی و تمنّا“، ”داغہائے فراق“، ”ویژن تصورات“، ”بیا درد نہ پہ خندادی“، ”شاہین و تخیل“ اردو مجموعہ کلام، ”دبختو غزلیا تو مجموعہ“ اردو فارسی اور عربی مرثیوں کا مجموعہ، پشتو شاعری کا مجموعہ، پشتو غزلیات کے تین مجموعے۔

اس وقت میرے سامنے ان کا پشتو غزلیاتی مجموعہ بنام ”شاہین و تخیل“ موجود ہے، اس کے پہلے صفحے پر ان کا یہ شعر ان کے اعلیٰ شعری ذوق پر دلالت کرتا ہے۔

جوڑہ ہنگامہ وہ تماشائی تہم خلقت ولاژ وخت چی خیز ولی ز پہ دار و م خوتانہ لیدم

اگر میں اس شعر کا اردو ترجمہ پیش کرنے کی بجائے درج ذیل فارسی شعر پیش کروں تو زیادہ موزوں ہوگا۔

بجرم عشق تو ام می کشند غوغا نیست تو نیز بر سر بام آ کر خوش تماشا نیست

انہوں نے اپنے والد محترم حضرت مولانا عبدالحلیم زروہیؒ کی شعری زبان میں مختلف اوقات میں جو نذرانے پیش

کئے ہیں ان کا ہر ایک شعر انتخاب ہے، مگر بطور نمونہ ذیل کے چند اشعار ملاحظہ کر کے ان کے شعری ذوق کی داد دیجئے۔ یہ اشعار انہوں نے اپنے والد کی جدائی میں کہے ہیں، جو آج خود ان کے فراق پر سناں باندھ رہے ہیں۔

وہ کیا دل ہے کہ جس میں تمہاری یاد نہیں وہ کیسے لب ہیں جن پہ نوحہ و فریاد نہیں
شکوہ سنجی پر اتر آئے ہیں اے پیر فلک اسیر دام کو کیوں شکوہ صیاد نہیں
تیرے حضور یہ نذرانہ لے کے آیا ہوں غمِ فراق سے فانی ترا آزاد نہیں
آہ! کسی کی موت پر یہ نالہ و شیون ہے آج حیف کس کے ہجر کے نوحہ پر تر دامن ہے آج
کس کی رحلت سے متاع اہل دانش لٹ گئی کس کے جانے سے غزاں منظر یہی گلشن ہے آج
دم گرفتہ درگو ہے خوشنوائے عہد گل حسرتا خاموش وہ فانوس علم و فن ہے آج
آہ فانی رفت از دنیائے دوں شیخ زمن خاک کی آغوش میں خوابیدہ اک مخزن ہے آج
اب کہاں وہ بزمہا و حلقہ ہائے علم و فن حسرتا ایسی محافل سے ہوئے محروم ہم
فانی بیچارہ اُف یہ کون زیرِ خاک ہے درحقیقت نازش اہل عرب فجرِ عجم
تیری تربت پر چراغِ طور نور افشاں رہے
حشر تک تو ہم نشینِ رحمت یزداں رہے

مولانا عبدالقیوم حقانی سے والہانہ تعلق:

فخر حقانی، ادیب شہیر اور نابغہ روزگار شخصیت حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی اور مولانا محمد ابراہیم فانی کا ایک دوسرے کے ساتھ سگے بھائیوں جیسا تعلق رہا ہے، تصنیف و تالیف کے میدان میں دونوں نے ایک ساتھ قدم رکھا، چنانچہ اول الذکر نے حضرت شیخ مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کے آمالی ترمذی کو ”حقائق السنن“ کے نام سے مرتب کئے، توضیح السنن اور شرح شمائل ترمذی کو مرتب کیا اب صحیح مسلم کی شرح کا ۱۶ جلدوں میں شائع کرنے کا انتظام ہو رہا ہے، دفاع امام ابوحنیفہ کو دیوبند سے سراہا گیا، ارباب علم و کمال اور پیشہ رزق حلال پرنیشنل بک فاؤنڈیشن نے تعریفی سرٹیفکیٹ دیا۔ ان سب اور ان کے علاوہ کئی دیگر کتب پر مولانا فانی نے منظوم و منثور کلمات کہے۔ مولانا فانی نقوش حقانی میں لکھتے ہیں: ”برادر محترم حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب حقانی اور راقم السطور مادر علمی دارالعلوم حقانیہ میں موقوف علیہ اور دورہ حدیث شریف میں ہم سبق رہے ہیں، اور یہ حسن اتفاق کہ یہاں دارالعلوم میں سات آٹھ سال سے تدریسی ہم سفر بھی ہیں۔“

ماو مجنون ہم سبق بودیم درد یوان عشق اوصحر ارفت و مادر کوچہ ہارسوا شدیم
بنابریں تعلق جس دن میں نے اخبار میں وفاتِ فانی کی اٹھا کر پڑھی، تو حضرت حقانی ہی کو تعزیت کا مستحق سمجھا

کہ وہ ہی ان کے ہم دم دیرینہ اور صحیح واقف حال تھے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو زمانے پر کیا گزری

تحریر میں ادبی تنقید کی جھلک:

مولانا محمد ابراہیم فانی بے شک بہت بڑے شاعر و ادیب تھے، مگر ساتھ ساتھ ان کی تحریر میں ادبی تنقید کی جھلک بھی موجود ہے ملاحظہ ہو:

”مولانا حقانی کی اردو تحریروں خصوصاً ان کی زیر بحث کتاب ”ارباب علم و کمال“ میں ایسے مرکب الفاظ بکثرت ملتے ہیں جو صفت و موصوف اور مضاف و مضاف الیہ سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان مرکبات اضافی و توصیفی نے مولانا کی تحریروں اور عبادتوں میں نہایت شرینی اور خوبصورتی پیدا کی ہے، مسلمہ اردو ادیبوں کی تحریروں میں ایسے مرکبات بکثرت پائے جاتے ہیں، ان مرکبات سے اردو ادب میں وسعت اور حسین اضافہ ہوا ہے، اور ادیبانہ اور فطری ذوق کے لئے یہ موجب تسکین بھی ہیں، اس قسم کی ترکیبات کے موجودوں میں غالب، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غالب نے جو بہت سی ترکیبیں ایجاد کی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں، مثلاً موج خرام یار، دلفریبی انداز نقش پا، بت مشکل پسند، جلوہ زار آتش دوزخ وغیرہ“

صحبت یار آخر خرسد:

یہ مولانا فانی کا تجویز کردہ عنوان ہے جو آج خود ان کے لئے استعمال ہو رہا ہے، ملاحظہ ہو ”اور یہ بھی ایک عجیب لطیفہ ہے کہ جب حضرت الشیخ کا سانحہ ارتحال پیش آیا تو برادر کرم مولانا حقانی اور راقم کچھ تذکرہ کر رہے تھے، اس میں ذکر ان ملاقاتوں کا آیا جو کہ آپ بعد العصر حضرت الشیخ کی بابرکت مجلس میں حاضری میں کیا کرتے تھے، میں نے ان سے کہا کہ اب تو اس سلسلہ میں قارئین ”الحق“ محروم ہو جائیں گے۔ پھر راقم نے مولانا کو عرض کیا کہ اس آخری صحبت کا عنوان یہ رکھ دیں ”صحبت یار آخر خرسد“ اور یہ عنوان بندہ (فانی) نے آپ کو اس شعر سے مستعار لے کر کہا: حیف در چشم زدن صحبت یار آخر خرسد روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر خرسد (نقوش حقانی ص: ۵۶)

چنانچہ راقم التحریر مولانا فانی کے درجہ بالا الفاظ بلا کم و کاست خدا کیلئے بطور ”بضاعتنا و دت الینا“ استعمال کر رہا ہے اور آخر میں مولانا سید سلیمان ندوی کے ان اشعار کے ساتھ اجازت چاہتا ہے:

رحمت اللہ علیک خیر اخلاف الکرام نم قریر العین فی قبرک الی یوم القیام

کنت فی الدنیا سلاماً صرت فی دار السلام امسکت الموت خطیب القوم حسان الکلام